تدبّرِ قرآن

۹۰

البلد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۱۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

یہ سورہ سابق سورہ —— الفجر —— کی توام ہے۔ دونوں کے عمود میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے۔ سابق سورہ میں انسان کی اس غلط فہمی پر متنبہ فرمایا گیا ہے کہ جب اس کو نعمت ملتی ہے تو وہ یہ خیال کر کے اکڑنے اور اترانے لگتا ہے کہ یہ اس کا حق ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس کی عزت افزائی فرمائی ہے اور اگر کوئی آزمائش پیش آجاتی ہے تو مایوس و دل شکستہ ہو جاتا ہے کہ یہ اس کی حق تلفی ہوئی ہے اور خدا نے اس کو ذلیل کر دیا ہے۔ حالانکہ ان میں سے کوئی حالت بھی نہ عزت افزائی کے لیے پیش آتی نہ ذلیل کرنے کے لیے بلکہ ان کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ بندے کے شکر یا صبر کا امتحان کرتا ہے۔ انسان کے لیے صحیح رویہ یہ ہے کہ نہ نعمت پا کر اکڑنے والا بنے نہ اس سے محروم ہو کر دل شکستہ و مایوس ہو بلکہ نعمت ملے تو اپنے رب کا شکرگزار بندہ بنے اور اس نعمت میں اللہ کے دوسرے حاجتمند بندوں کو شریک کرے اور اگر کوئی افتاد پیش آئے تو اپنی محرومی کا رونا رونے اور خدا کو کوسنے کے بجائے فیصلۂ تقدیر پر صابر و راضی رہے۔ جو بندہ یہ روش اختیار کرتا ہے اس کا نفس 'نفسِ مطمئنہ' ہے اور آخرت میں اس کو 'رَاضِیَۃً مَّرْضِیَّۃً' کی بادشاہی حاصل ہوگی۔

اس سورہ میں اسی کلیہ کو قریش پر منطبق کیا ہے اور یہ دکھایا ہے کہ یہ سرزمین —— سرزمین مکہ —— اس زمانے میں جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے فرزند، حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو یہاں بسایا ہے، رزق کے وسائل سے بھی محروم تھی اور امن سے بھی۔ لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام اور ان کی ذریت کے لیے رزق اور امن کی جو دعا فرمائی اس کی برکت سے یہاں رزق کی بھی فراوانی ہوئی اور امن کے اعتبار سے بھی اس علاقے کا یہ حال ہوا کہ یہاں کسی انسان تو درکنار کسی جانور کو بھی دکھ پہنچانا گناہ ٹھہرا۔ اسی امن اور رزق کا یہ فیض ہے کہ اولادِ اسمٰعیل یہاں خوب پھلی پھولی اور اس پورے ملک پر اس کو سیادت و قیادت حاصل ہوئی۔ لیکن یہ نعمتیں پا کر اپنی پچھلی تاریخ یہ لوگ بھول بیٹھے۔ اب یہ اس زعم میں مبتلا ہیں کہ یہ جو کچھ ان کو

حاصل ہے ان کا پیدائشی حق ہے۔ خدا کی راہ میں خرچ کرنا ان کے دلوں پر بہت گراں گزرتا ہے۔ ان کی آنکھیں عبرت نگاہی سے محروم اور زبانیں حق وصبر اور نیکی و احسان کے ذکر سے گنگ ہو چکی ہیں۔ اب ان کا مال ان کی اپنی عیاشیوں اور فضول خرچیوں کے لیے ہے۔ کوئی نہیں ہے جو یتیموں اور مسکینوں کی خدمت کی راہ میں کوئی قربانی پیش کرنے اور آخرت کی ابدی فائز المرامی حاصل کرنے کا حوصلہ کرے بلکہ سب نے جہنم کی راہ اختیار کر لی ہے۔

یہ سورتیں چونکہ بالکل ابتدائی دور کی ہیں اس وجہ سے ان میں خطاب بھی بالعموم یٰٓاَیُّھَا الْاِنْسَانُ سے ہے اور ان میں جو دعوت یا اپیل ہے وہ بھی تمام تر انسانیت اور اس کے فطری مبادی پر مبنی ہے۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

سورہ کے مطالب کی ترتیب اس طرح ہے:

(۱-۴) سرزمین حرم اور بنی اسمٰعیل کی ابتدائی تاریخ سے اس بات کی شہادت کہ یہ علاقہ بالکل بے آب و گیاہ تھا جس میں زندگی نہایت مشقت کی زندگی تھی لیکن اللہ تعالیٰ کے فضل، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا اور بیت اللہ کی برکت سے یہ ایک پُرامن علاقہ بن گیا اور اس کے باشندوں کو رزق و مال کی فراوانی حاصل ہوئی۔

(۵-۷) اللہ تعالیٰ کے اس فضل و احسان کا حق یہ تھا کہ لوگ اس کے شکر گزار اور اس کے غریب بندوں کے ہمدرد و مددگار بنتے لیکن حال یہ ہے کہ اگر راہِ خدا میں ان کو انفاق کی دعوت دی جائے تو کہتے ہیں کہ کہاں تک کوئی خرچ کرے؟ ڈھیروں مال تو اڑا چکے! گویا ان کو گمان ہے کہ خدا ان کی ان شاہ خرچیوں کو دیکھ نہیں رہا ہے!

(۸-۱۷) ان زر پرستوں کو ملامت کہ اللہ نے ان کو آنکھیں دی تھیں کہ ان سے عبرت حاصل کرتے، زبان اور ہونٹ دیے تھے کہ ان سے لوگوں کو یتیموں اور مسکینوں کی اعانت پر ابھارتے، نیکی اور بدی کا امتیاز دیا تھا کہ بدی کی ترغیبات کا مقابلہ کر کے نیکی کے کام کرتے، یتیموں اور مسکینوں کی مدد کرتے، ایمان والوں اور صبر و ہمدردی کی دعوت دینے والوں میں سے بنتے لیکن یہ سب کچھ پا کر وہ اپنے رب کے شکر گزار بننے کے بجائے اپنے نفس اور مال کے پرستار بن کر بیٹھ رہے۔

(۱۸-۲۰) حالانکہ اگر یہ راہ اختیار کرتے تو اللہ کے ہاں بڑے اجر کے مستحق ٹھہرتے لیکن انھوں نے اللہ کی آیات کا انکار اور اپنے لیے دوزخ کی آگ کا سامان کیا۔

سُوْرَةُ الْبَلَدِ

مَكِّيَّةٌ ——— اٰيَات : ۲۰

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آيات ۱-۲۰

لَآ اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ ۝۱ وَاَنْتَ حِلٌّۢ بِهٰذَا الْبَلَدِ ۝۲ وَ وَالِدٍ وَّمَا وَلَدَ ۝۳ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْ كَبَدٍ ۝۴ اَيَحْسَبُ اَنْ لَّنْ يَّقْدِرَ عَلَيْهِ اَحَدٌ ۝۵ يَقُوْلُ اَهْلَكْتُ مَالًا لُّبَدًا ۝۶ اَيَحْسَبُ اَنْ لَّمْ يَرَهٗٓ اَحَدٌ ۝۷ اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَيْنَيْنِ ۝۸ وَلِسَانًا وَّشَفَتَيْنِ ۝۹ وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ ۝۱۰ فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ ۝۱۱ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ ۝۱۲ فَكُّ رَقَبَةٍ ۝۱۳ اَوْ اِطْعٰمٌ فِيْ يَوْمٍ ذِيْ مَسْغَبَةٍ ۝۱۴ يَّتِيْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ ۝۱۵ اَوْ مِسْكِيْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ ۝۱۶ ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ ۝۱۷ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ ۝۱۸ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا هُمْ اَصْحٰبُ الْمَشْئَمَةِ ۝۱۹ عَلَيْهِمْ نَارٌ مُّؤْصَدَةٌ ۝۲۰

وقف لازم

ع ۱ / ۲۰ / ۱۵

ترجمہ آیات ۱-۲۰

نہیں! میں قسم کھاتا ہوں اس سرزمین کی ——— اور تم اسی سرزمین میں مقیم ہو ——— اور باپ اور اس کی ذریت کی کہ ہم نے انسان کو بڑی مشقت میں پیدا کیا۔ ۱-۴

کیا وہ گمان رکھتا ہے کہ اس پر کسی کا زور نہیں! کہتا ہے کہ میں نے ڈھیروں مال اڑا دیا! کیا وہ سمجھتا ہے کہ اس کو کسی نے دیکھا نہیں! ۵-۷

کیا ہم نے اس کو دو آنکھیں نہیں دیں اور ایک زبان اور دو ہونٹ نہیں دیئے اور اس کو دونوں راہیں نہیں سجھا دیں! پھر اس نے گھاٹی نہیں پار کی اور تم کیا سمجھے کہ کیا ہے وہ گھاٹی! گردن کو چھڑانا یا بھوک کے زمانے میں کسی قرابت مند یتیم یا کسی خاک آلود مسکین کو کھلاتا —— پھر وہ بنے ان میں سے جو ایمان لائے اور جنھوں نے ایک دوسرے کو صبر اور ہمدردی کی نصیحت کی۔ یہی خوش بخت لوگ ہیں۔ اور جنھوں نے ہماری آیات کا انکار کیا وہ کم بختی والے ہیں۔ وہ آگ میں موندے ہوئے ہوں گے۔ ۸-۲۰

الفاظ و اسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

لَآ اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ (۱)

یہاں 'لَا' اسی طرح آیا ہے جس طرح 'لَآ اُقْسِمُ بِیَوْمِ الْقِیٰمَۃِ' (القیٰمۃ - ۷۵ : ۱) اور بعض دوسرے مقامات میں آیا ہے۔ اس کی وضاحت ہو چکی ہے۔ یہ قسم سے پہلے مخاطب کے اس خیالِ باطل کی تردید کے لیے ہے جس کا سابق سورہ میں حوالہ ہے۔ سابق سورہ میں یہ بات گزر چکی ہے کہ لوگوں کو جب مال و جاہ کی نعمت ملتی ہے تو اس کو اپنی تدبیر و تدبّر کا کرشمہ سمجھ بیٹھتے اور اتراتے ہیں کہ وہ خدا کی نظروں میں بلند مرتبہ ہیں اس وجہ سے اس نے دوسروں کے مقابل میں ان کو یہ سرفرازی بخشی ہے۔ اس خیالِ باطل کی تردید سابق سورہ میں ایک دوسرے پہلو سے ہوئی ہے۔ اس سورہ میں اس کی تردید ایک اور پہلو سے آ رہی ہے جس کا آغاز قسم سے ہوا ہے اور اس قسم سے پہلے 'لَا' ان کے زعم باطل کی تردید کے لیے ہے۔ گویا ان لوگوں کا یہ خیال اس قدر بے بنیاد اور لغو ہے کہ اس کی تردید میں اتنے توقف کی بھی ضرورت نہیں ہے کہ دلیل بیان کر لینے کے بعد اس کی نفی کی جائے۔ یہ اسلوبِ کلام ہر زبان میں پایا جاتا اور اس موقع پر اختیار کیا جاتا ہے جب مقصود مخاطب کے خیال کی لغویت کا اظہار ہو۔

قسم سے پہلے 'لا' کا محل استعمال

قسم یہاں بطورِ شہادت اصل دعوے کی تائید میں کھائی گئی جو آگے 'لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ كَبَدٍ' (۴) کے الفاظ میں مذکور ہے۔

اصل دعویٰ جس پر قسم کھائی گئی ہے۔

'بِھٰذَا الْبَلَدِ' سے مراد سرزمینِ مکّہ ہے۔ سورۂ تین میں بھی اس کی قسم 'وَھٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِیْنِ' (التین - ۹۵ : ۳) کے الفاظ سے کھائی گئی ہے۔ قرآن مجید کی دوسری قسموں کی طرح یہ قسم بھی، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، سرزمینِ حرم کے تقدّس کے پہلو سے نہیں بلکہ اس دعوے پر دلیل کے پہلو سے کھائی گئی ہے جو آگے مذکور ہے۔

وَاَنْتَ حِلٌّۢ بِھٰذَا الْبَلَدِ (۲)

ایک برمحل جملہ معترضہ

یہ جملہ قسم کے بیچ میں، بطور جملہ معترضہ، قسم کی تائید و تصویب کے طور پر ہے۔ ضمیر خطاب کے مخاطب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی ہو سکتے ہیں اور قریش بھی۔ دونوں ہی صورتوں میں اصل مدّعا کے اعتبار سے کچھ زیادہ فرق نہیں ہوگا۔ مطلب یہ ہے کہ یہ کسی ایسے دور دراز علاقے کی شہادت نہیں پیش کی جا رہی ہے جس کے حالات کا اندازہ کرنے اور جس کی تاریخ کا علم حاصل کرنے

کے لیے کوئی زحمتِ سفر اٹھانی پڑے بلکہ تم یہاں مقیم اور اس کے ماضی و حاضر سے اچھی طرح باخبر ہو۔ یہ تمھارا مامن و مستقر اور تمھارا محبوب وطن ہے۔ اس کی تاریخ تمھاری اپنی ہی تاریخ ہے۔ اس کے گرم و سرد اور خشک و تر دونوں سے تم گزرے ہوئے ہو۔ اچھی طرح اندازہ کر سکتے ہو کہ جو بات کہی جا رہی ہے وہ حرف حرف حق ہے یا اس میں کوئی مبالغہ یا آورد ہے۔

وَوَالِدٍ وَّمَا وَلَدَ (۳)

حضرت ابراہیمؑ اور ان کی ذریت کی شہادت

جملہ معترضہ کے بعد یہ ٹکڑا قسم سے متعلق اور اس کی تکمیل ہے۔ سرزمین مکہ کی قسم کے بعد اس میں بسنے والے باپ اور اس کی ذریت کی قسم ہے۔ 'وَالِدٍ' سے مراد ظاہر ہے کہ حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام اور 'وَمَا وَلَدَ' سے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی ذرّیت ہے جو سرزمینِ مکہ میں آباد ہوئی اور پھر تمام عرب میں پھیلی۔ لفظ 'وَالِدٍ' کی تنکیر تفخیم شان کے لیے بھی ہو سکتی ہے اور اس کا یہ فائدہ بھی ہے کہ اس سے حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی مراد لیے جا سکتے ہیں اور حضرت اسماعیل علیہ السلام بھی۔ اسی طرح 'وَمَا وَلَدَ' میں جو تعمیم ہے وہ تمام بنی اسماعیل پر حاوی ہے، خواہ ان کا تعلق بنی اسماعیل کی کسی شاخ سے بھی ہو۔

سرزمین مکہ کی پچھلی تاریخ کی طرف اشارہ

'لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ کَبَدٍ' (۴) 'کبد' کے معنی مشقت اور شدّت کے ہیں۔ لفظ 'اِنْسَان' اگرچہ عام ہے اور اس کے عام ہونے کے کئی فائدے ہیں لیکن یہاں اس عام سے مراد خاص طور پر قرآن کے اولین مخاطب بنی اسماعیل بالخصوص قریش ہیں۔ سرزمین حرم میں ان کے بزرگ اجداد کی آمد اور سکونت اور ان کی ذریت کی ابتدائی تاریخ کا حوالہ دے کر قریش کو متنبہ فرمایا گیا ہے کہ آج اس سرزمین میں تم کو جو فراخئ رزق و رفاہیت حاصل ہے یہ نہ سمجھو کہ یہی حال ہمیشہ سے رہا ہے یا یہ حالت تمھاری ذہانت و قابلیت کی بدولت ہوئی ہے۔ جس زمانے میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہاں حضرت اسماعیل علیہ السلام کو بسایا ہے اس وقت یہ علاقہ ایک بالکل بنجر، بے آب و گیاہ اور غیر مامون علاقہ تھا۔ یہاں کے لوگوں کی زندگی خانہ بدوشانہ اور نہایت مشقت کی زندگی تھی۔ معاش کا انحصار گلہ بانی پر تھا اور ہر شخص اپنی زندگی اور اپنے گلے کی حفاظت کا ذمہ دار خود تھا۔ لوگوں کی حفاظت کے لیے کوئی نظامِ عدل اور قانون موجود نہیں تھا لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب حضرت اسماعیل علیہ السلام کو یہاں بسایا تو ان کے اور ان کی اولاد کے لیے یہ دعا فرمائی کہ اللہ تعالیٰ اس وادئ غیر ذی زرع میں ان کو رزق و فضل سے بھی بہرہ مند فرمائے اور امن سے بھی متمتع رکھے۔ یہ اسی دعا کی برکت ہے کہ رزق کے دروازے بھی کھلے اور بیت اللہ کی تولیت اور اشہر حرم کی امن بخشی کی بدولت سفر اور تجارت کی راہیں بھی فراخ ہوئیں جس سے ان کی معاشی حالت مشقت کی جگہ رفاہیت و خوش حالی میں

تبدیل ہو گئی یہاں تک کہ آج تم اس کے غرور میں نہ خدا کو خاطر میں لا رہے ہو نہ اس کے رسول کو بلکہ یہ سمجھ بیٹھے ہو کہ یہ جو کچھ تمھیں حاصل ہے یہ تمھارا پیدائشی حق ہے، تم اس میں ہر قسم کے تصرف کے مجاز ہو، کسی کی طاقت نہیں ہے کہ تمھارے اس عیش اور اس آزادی میں خلل انداز ہو سکے۔

قریش کی اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے قرآن نے جگہ جگہ حرم کی اس تاریخ کی یاد دہانی کر کے ان کو متنبہ فرمایا ہے کہ اگر وہ اللہ کی بخشی ہوئی نعمت پا کر طغیان میں مبتلا ہو گئے تو یاد رکھیں کہ وہ خود اپنے ہی ہاتھوں اپنے ہی پاؤں میں کلہاڑی ماریں گے۔ سورۂ ابراہیم میں اسی حقیقت کی طرف توجہ دلائی ہے:

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا وَّاجْنُبْنِيْ وَبَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ ۝ رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ ۚ فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ ۚ وَمَنْ عَصَانِيْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ رَبَّنَآ اِنِّيْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ ۙ رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ اَفْـِٕدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْٓ اِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ ۝ (ابراہیم ۱۴: ۳۵-۳۷)	اور جب کہ دعا کی ابراہیم نے اے میرے رب! اس سرزمین کو پُرامن سرزمین بنا اور مجھ کو اور میری اولاد کو بچا کہ ہم بتوں کی پرستش کی چھوت سے آلودہ ہوں۔ اے میرے رب! ان بتوں نے تو لوگوں کے اندر سے ایک خلقِ کثیر کو گمراہ کر رکھا ہے۔ تو جو میری پیروی کرے وہ تو مجھ سے ہے اور جو میری نافرمانی کرے تو تو مغفرت فرمانے اور رحم کرنے والا ہے۔ اے ہمارے رب! میں نے اپنی ذریت میں سے بعض کو ایک بن کھیتی کی زمین میں بسایا ہے، تیرے محترم گھر کے پاس، اے رب! اس لیے کہ یہ نماز کا اہتمام کریں تو لوگوں کے دل ان کی طرف تو مائل کر دے اور ان کو پھلوں کی روزی عطا فرما کہ یہ شکر گزاری کریں۔

ان آیات پر تدبر کی نگاہ ڈالیے تو ان سے مندرجہ ذیل حقائق سامنے آئیں گے:

قریش کو چند حقائق کی یاد دہانی

- یہ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی اولاد میں سے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو ایک غیر آباد اور بنجر علاقے میں جو بسایا تو اس لیے کہ اس کو مشرکانہ ماحول سے دور اور محفوظ رکھیں۔
- اس علاقہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بیت اللہ کی تعمیر فرمائی تاکہ ان کی ذریت

اس کو اللہ تعالیٰ کی عبادت کا مرکز بنائے اور ساتھ ہی یہ دعا بھی فرمائی کہ اس مرکز اور ان کی ذرّیت کو خلق کی مرجعیّت حاصل ہو۔

— یہ علاقہ اس وقت زینی پیداوار اور امن سے بالکل محروم علاقہ تھا۔ اس وجہ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس کے باشندوں کے لیے روزی کی فراخی کی بھی دعا فرمائی اور علاقہ کے لیے امن کی بھی۔

مقصود اس تفصیل سے اس حقیقت کا اظہار ہے کہ آج قریش کو جو مال و جاہ اور جو سطوت و اقتدار بھی حاصل ہے اس میں نہ ان کی ذاتی سعی و تدبیر کو کوئی دخل ہے اور نہ ان کے خاندانی استحقاق کو بلکہ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا اور بیت اللہ کی برکت ہے جس سے وہ بہرہ مند ہو رہے ہیں اور یہ برکت ان کے لیے غیر مشروط نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی بندگی، بیت اللہ کے مقصد کی تکمیل اور ان کے اندر مبعوث ہونے والے رسول پر ایمان کے ساتھ مشروط ہے[1]۔ اگر وہ ان شرطوں کے پابند رہیں گے تو ان کو یہ عزت و سرفرازی حاصل رہے گی ورنہ یہ سب چھن جائے گی۔

اسی بنیاد پر اللہ تعالیٰ نے قریش سے سورۂ قریش میں مطالبہ فرمایا ہے کہ اگر بیت اللہ کی برکتوں سے وہ بہرہ مند رہنا چاہتے ہیں تو اس کا واحد طریقہ یہ ہے کہ وہ اس گھر کے خداوند کی عبادت کریں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر وہ ایسا نہیں کریں گے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ وہ اس گھر پر قابض اور اس کی برکتوں کے حقدار بنے رہیں۔ فرمایا ہے:

لِاِیۡلٰفِ قُرَیۡشٍ ۙ اٖلٰفِہِمۡ رِحۡلَۃَ الشِّتَآءِ وَ الصَّیۡفِ ۚ فَلۡیَعۡبُدُوۡا رَبَّ ہٰذَا الۡبَیۡتِ ۙ الَّذِیۡۤ اَطۡعَمَہُمۡ مِّنۡ جُوۡعٍ ۬ۙ وَّ اٰمَنَہُمۡ مِّنۡ خَوۡفٍ ٪ (القریش ۱۰۶: ۱-۴)	بوجہ اس کے کہ قریش کو الفت بخشی گئی جاڑے اور گرمی کے سفر کی تو ان کو چاہیے کہ اس گھر کے خداوند کی عبادت کریں جس نے قحط میں کھلایا اور خطرے سے نچنت کیا۔

اَیَحۡسَبُ اَنۡ لَّنۡ یَّقۡدِرَ عَلَیۡہِ اَحَدٌ ﴿۵﴾

مطلب یہ ہے کہ جن کو اس سرزمین کی ابتدائی تاریخ معلوم ہے ان کے لیے تو اس کی موجودہ رفاہیّت سے اس غلط فہمی میں پڑنے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ اب ان کی جڑیں اتنی مضبوط ہو چکی

---

[1] بعض دوسری آیات سے یہ ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ سے امامت و سیادت کا جو وعدہ فرمایا تھا وہ مشروط بشرائط تھا۔ وہ لوگ اس سے مستثنیٰ کر دیے گئے تھے جو ان کے طریقہ کو چھوڑ بیٹھیں۔

ہیں کہ کوئی ان کو اکھاڑ نہیں سکتا۔ جس نے ان کو ایک بے آب و گیاہ زمین میں یہ فراوانیٔ رزق بخشی وہ ان کو جب چاہے تباہ بھی کر سکتا ہے بالخصوص جب کہ انھوں نے اس مقصد کو بھی برباد کر دیا ہے جس کے لیے ان کو یہاں آباد کیا گیا اور جس کی خاطر ہی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کے لیے دعا فرمائی۔

يَقُولُ أَهْلَكْتُ مَالًا لُّبَدًا ۝ أَيَحْسَبُ أَن لَّمْ يَرَهُ أَحَدٌ (۶-۷)

فاسد ذہنیت سے فاسد کردار

اوپر کی آیت میں ان کی اس ذہنیت سے پردہ اٹھایا گیا ہے جس میں مال و جاہ کی فراوانی نے ان کو مبتلا کر دیا تھا۔ اس آیت میں ان کے اس کردار سے پردہ اٹھایا جا رہا ہے جو اس فاسد ذہنیت نے ان کے اندر پیدا کیا۔

جن کے اندر یہ گھمنڈ پیدا ہو جاتا ہے کہ ان کو جو مال و جاہ حاصل ہے یہ ان کا پیدائشی حق اور ان کی قابلیت و ہنر کا کرشمہ ہے، ان کے اندر انفاق کا جذبہ بالکل مردہ ہو جاتا ہے اس لیے کہ ان کو نہ خدا کی پروا رہ جاتی نہ آخرت کی۔ اس طرح کے لوگ اپنی بخالت پر پردہ ڈالے رکھنے کے لیے مستحقین کے سامنے ہمیشہ اپنے وسیع مصارف کا رونا روتے رہتے ہیں اور اس طرح ان کو باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ انھیں ذاتی مصارف کے علاوہ قومی و اجتماعی مصارف پر اتنا خرچ کرنا پڑتا ہے کہ وسیع ذرائع آمدنی رکھنے کے باوجود مشکل ہی سے کچھ پس انداز ہوتا ہے۔ یہی طریقہ وہ ان لوگوں کو چپ کرنے کا اختیار کرتے ہیں جو ان کو خدا اور آخرت کے نام پر انفاق کی دعوت دیتے ہیں۔ ان کو وہ جواب دیتے ہیں کہ آخر کہاں تک خرچ کیے جائیں! ڈھیروں مال تو اسی طرح کے مصارف پر اٹھا چکے ہیں! مَالًا لُّبَدًا کے معنی ہیں کثیر اور ڈھیروں مال۔

أَيَحْسَبُ أَن لَّمْ يَرَهُ أَحَدٌ۔ یہ اس طرح کے شیخی بگھارنے والوں کو جواب ہے کہ یہ لوگ یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ ان کی ان فیاضیوں کو کوئی دیکھ نہیں رہا ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ سب کچھ دیکھ رہا ہے۔ وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ یہ دیتے دلاتے کوڑی بھی نہیں لیکن اپنی شاہ خرچیوں کا اشتہار بہت دیتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ایک دن ان کا یہ تمام زبانی جمع خرچ ان کے آگے بھی آ جائے گا اور خلق کے سامنے بھی۔

أَلَمْ نَجْعَل لَّهُ عَيْنَيْنِ ۝ وَلِسَانًا وَشَفَتَيْنِ ۝ وَهَدَيْنَاهُ النَّجْدَيْنِ (۸-۱۰)

نعمتوں کا صحیح مصرف

یعنی یہ لوگ مال و دولت پا کر اسی میں کھوئے گئے حالانکہ اللہ نے ان کو اس سے بھی بڑی نعمتیں دی تھیں، اگر یہ ان کے بھی قدردان ہوتے تو اس طرح خزف ریزوں کے عشق میں اندھے ہو کر اس ابدی بادشاہی کو نہ گنوا بیٹھتے جو اس فانی دولت کے ذریعے وہ حاصل کر سکتے تھے۔ فرمایا کہ وہ غور کریں کہ کیا ہم نے ان کو دو آنکھیں نہیں دیں کہ وہ ان سے اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیں اور

دیکھیں کہ ایک طرف تو ہم نے ان کو مال و جاہ سے نوازا اور دوسری طرف ان کے آگے پیچھے ایسے یتیم و نادار، غریب و لاچار، اور کمزور و بیمار بھی ہیں جو نانِ شبینہ کو محتاج، تن ڈھانکنے سے مجبور، آنکھوں اور ہاتھ پاؤں کی نعمت سے محروم ہیں۔ ہم نے آنکھیں دے کر ان کو یہ منظر اس لیے دکھایا کہ وہ اس سے عبرت حاصل کریں اور اپنے رب کے شکر گزار بنیں کہ اس نے محض اپنے فضل سے ان کو اس طرح کی کسی آزمائش سے محفوظ رکھا اور پھر اس شکر گزاری کا حق یوں ادا کریں کہ پوری فیاضی سے ان ضرورت مندوں پر اپنا وہ مال صرف کریں جو ان کے رب نے اس طرح کے لوگوں کے حق کی حیثیت سے ان کی تحویل میں دیا۔

مطلب یہ ہے کہ آنکھوں کا کوئی صحیح مصرف ہے تو یہی عبرت نگاہی اور اثر پذیری ہے۔ اگر وہ یہ کام نہ کریں تو ان کے ہونے سے نہ ہونا بہتر ہے۔

وَلِسَانًا وَّشَفَتَيْنِ یعنی آنکھوں کے ساتھ اس نے انسان کو ایک زبان اور دو ہونٹ بھی عنایت فرمائے تاکہ وہ جو کچھ دیکھے اور محسوس کرے اس پر خود بھی عمل پیرا ہو اور اپنی زبان سے دوسروں کو بھی اس پر ابھارے تاکہ اس کی تشویق و ترغیب سے دوسروں کے اندر بھی وہ نیکی پھیلے۔ سابق سورہ میں اسی چیز کی طرف وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰی طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ (الفجر - ۸۹: ۱۸) (اور تم مسکینوں کو کھلانے پر لوگوں کو نہیں ابھارتے) کے الفاظ سے توجہ دلائی ہے۔ اور اس سورہ میں آگے اسی مضمون کی تکمیل ان الفاظ میں کی ہے: ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ (۱۷) (پھر وہ بنے ان لوگوں میں سے جو ایمان لائے اور جنھوں نے ایک دوسرے کو صبر اور ہمدردی کی نصیحت کی)۔

اس آیت سے یہ حقیقت سامنے آئی کہ انسان جس نیکی کا احساس کرے اس کے انجام دینے کے لیے خود بھی اقدام کرے اور دوسروں کو بھی اس کے لیے ابھارے۔ یہ چیز اس کے فرائض میں داخل ہے ورنہ اس کی نیکی ادھوری رہ جائے گی۔ معاشرہ سے متعلق بھی ہر شخص پر اس کی صلاحیت کے اعتبار سے ذمہ داری عائد ہوتی ہے جس کو ادا کیے بغیر کوئی شخص عند اللہ بری نہیں ہو سکتا۔ یہاں اشارے پر قناعت کیجیے، ان شاء اللہ سورۂ عصر کی تفسیر میں وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ (العصر - ۱۰۳: ۳) کے تحت اس پر مفصل بحث آئے گی۔

ایک خاص نکتہ

یہاں ایک ضمنی نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے۔ وہ یہ کہ زبان کے ساتھ دو ہونٹوں کا ذکر فرمایا ہے جو زبان کو اوپر اور نیچے دونوں طرف سے محفوظ کیے ہوئے ہیں۔ قاعدہ ہے کہ جو چیز جتنی ہی قیمتی، جتنی ہی اثر آفرین اور جتنے ہی گہرے اور دور رس نتائج پیدا کرنے والی ہوتی ہے وہ اتنی ہی احتیاط سے محفوظ کی جاتی ہے تاکہ اس کے استعمال میں کوئی بے احتیاطی اور بے پروائی راہ نہ پائے

زبان بھی انسان کے نہایت قیمتی اور مؤثر اسلحہ میں سے ہے۔ یہ ایک شمشیر جوہر دار ہے۔ اسی وجہ سے قدرت نے اس کو میان میں چھپا کر انسان کو پکڑا یا تاکہ وہ اس کو وہیں میان سے باہر نکالے جہاں وہ ضرورت پیش آئے جس کے لیے قدرت نے اس کو بنایا ہے لیکن یہ عجیب بدقسمتی ہے کہ بالعموم لوگ اس سے اصل کام لینے کے بجائے گھاس کاٹنے کی درانتی کا کام لیتے ہیں۔

نیکی اور بدی کا شعور انسان کی فطرت میں ہے

وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ۔ یعنی شاہرہ وشعور اور نطق وبیان کی صلاحیت دینے کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے انسان پر یہ فضل بھی فرمایا کہ اس کو دونوں راستے بھی دکھا دیے۔ 'دونوں راستے' سے اشارہ انہی دونوں راستوں کی طرف ہے جن کا ذکر سورۂ دہر میں بدیں الفاظ گزر چکا ہے۔

اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا ۝ (الدھر۔ ۷۶: ۳) ہم نے اس کو راہ بھی دکھا دی۔ چاہے وہ شکر کرنے والا بنے یا ناشکرا بنے۔

اس سے زیادہ واضح لفظوں میں سورۂ شمس میں فرمایا ہے:

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۝ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۝ (الشمس۔ ۹۱: ۷-۸) اور شاہد ہے نفس اور اس کی اعلیٰ ساخت، پس ہم نے اس کو الہام کر دی اس کی بدی اور نیکی۔

یہ اسی حقیقت کا بیان ہے جس کی وضاحت ہم سورۂ قیامہ کی تفسیر میں کر چکے ہیں کہ بدی کا بدی ہونا اور نیکی کا محبوب ہونا اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت کے اندر ودیعت فرما دیا ہے۔ انسان اگر بدی کرتا ہے تو اس وجہ سے نہیں کہ وہ بدی کے شعور سے محروم ہے بلکہ وہ جذبات سے مغلوب ہو کر بدی کو بدی جانتے ہوئے اس کا ارتکاب کرتا ہے۔

فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ ۝ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ ۝ (۱۱-۱۲)

نعمتوں کی ناقدری پر اظہار افسوس

اب یہ مخاطبوں کی ناقدری و ناشکری کا بیان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو شعور و ادراک، نطق و بیان اور ہدایت کی روشنی سے جو نوازا تو اس کا حق یہ تھا کہ یہ نیکی اور ہمدردیٔ خلق کی راہ کے عقبات عبور کرنے کی کوشش، اللہ تعالیٰ کے خاص بندوں میں شامل ہونے کا شرف اور رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً کی بادشاہی حاصل کرتے لیکن یہ اپنی زرپرستی اور پست ہمتی کے سبب سے یہ حوصلہ نہ کر سکے بلکہ ان کا مال ان کے لیے زنجیر پا بن گیا۔

نیکی اور بدی کے مزاج میں فرق

'عَقَبَةٌ' کے معنی گھاٹی اور 'اِقْتِحَامٌ' کے معنی چڑھائی چڑھنے یا کوئی مشکل کام کرنے کے ہیں۔ یہاں اس لفظ سے نیکی کے ان کاموں کی طرف اشارہ ہے جو ہمدردیٔ خلق اور بندگیٔ رب کے نہایت اعلیٰ کام ہیں اور جن کی بعض مثالیں آگے مذکور ہیں۔ ان کاموں کو انجام دینے کے لیے چونکہ انسان کو ایثار و قربانی سے کام لینا پڑتا ہے جو انسان پر شاق ہے اس وجہ سے اس کو 'اقتحام عقبۃ'

(گھاٹی پار کرنے سے تعبیر فرمایا۔ یہاں وہ حقیقت ملحوظ رہے جس کی طرف ہم جگہ جگہ اشارہ کر چکے ہیں کہ جتنے بھی اعلیٰ کام ہیں ان کے لیے چونکہ نفس کو اس کی نقد لذتوں سے موڑ کر بالکل مختلف سمت میں لے جانا پڑتا ہے اس وجہ سے وہ بہت شاق گزرتے ہیں۔ اس کے برعکس ادنیٰ کاموں کی لذتیں نقد ہیں اس وجہ سے نفس ان کی طرف فوراً چل پڑتا ہے۔ اس حقیقت کو سیدنا مسیحؑ نے یوں واضح فرمایا ہے کہ نیکی کی راہ تنگ اور اس پر چلنے والے تھوڑے ہیں اور بدی کی راہ فراخ اور اس پر چلنے والے بہت ہیں۔ یہی حقیقت 'حُفَّتِ الجنۃ بالمکارہ' (جنت مشکلات سے گھیر دی گئی ہے) والی حدیث میں بھی واضح فرمائی گئی ہے۔

خدا کے مقرب بننے کے لیے بازیاں کھیلنی پڑتی ہیں

'وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ' میں جو اسلوب ہے اس کی وضاحت ہم جگہ جگہ کر چکے ہیں کہ یہ اندازِ سوال کسی چیز کی عظمت و شان یا اس کی ہولناکی کے اظہار کے لیے اختیار کیا جاتا ہے۔ یہاں مقصود مخاطبوں کو یہ بتانا ہے کہ تم صرف چند رسوم ادا کر کے خدا کے مقرب اور چہیتے بننے کے خواب دیکھ رہے ہو حالانکہ اس منزل تک پہنچنے کے لیے گھاٹیاں پار کرنی اور بازیاں کھیلنی پڑتی ہیں۔ مال کے پجاری بن کر تم اس مقام کو حاصل نہیں کر سکتے۔ اگر یہ حاصل کرنا چاہتے ہو تو آؤ سنو کہ اس کے لیے تمھیں کیا کیا کام کرتے ہیں۔

فَكُّ رَقَبَةٍ ۙ اَوْ اِطْعٰمٌ فِیْ یَوْمٍ ذِیْ مَسْغَبَةٍ ۙ یَّتِیْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ ۙ اَوْ مِسْكِیْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ (۱۳-۱۶)

غلاموں کی آزادی اسلام کی سر فہرست نیکیوں میں ہے

اس سلسلہ میں سب سے پہلے 'فَكُّ رَقَبَةٍ' (گردن آزاد کرنے) یعنی غلام آزاد کرنے کا ذکر فرمایا۔ یہاں وہ بات پیش نظر رکھیے جس کی طرف ہم تمہیدی بحث میں اشارہ کر چکے ہیں کہ یہ سورتیں بالکل ابتدائی دور کی ہیں اس وجہ سے ان میں اہل عرب سے خطاب بھی بیشتر لفظ 'انسان' سے ہوا ہے اور جن باتوں کے ان سے مطالبے کیے گئے ہیں وہ بھی تمام تر انسانیت اور فطرت کے بدیہی تقاضوں پر مبنی ہیں۔ غلاموں کو آزاد کرنا اور کرانا بھی ان نیکیوں میں سے ہے جن کے نیکی ہونے میں کسی معقول آدمی کو شک نہیں ہو سکتا۔ اہل عرب بھی اس کو ایک نہایت اعلیٰ نیکی کا کام سمجھتے رہے ہیں۔ قرآن نے اپنی دعوت کے بالکل ابتدائی دور ہی سے اس انسانی خدمت کو اپنی سر فہرست نیکیوں میں شامل کر لیا اور اس وقت کر لیا جب دنیا کے دوسرے گوشوں میں لوگ اس نیکی کے لیے بیدار نہیں ہوئے تھے۔ ہم نے سورۂ نور کی تفسیر میں تفصیل سے بتایا ہے کہ قرآن نے کس طرح ابتدا ہی سے اس نیکی کی تبلیغ شروع کی اور پھر کس طرح بالتدریج اپنے نظام کے اندر غلامی کا خاتمہ کر دیا۔

اس کے بعد یتیموں اور مسکینوں کو کھلانے کا ذکر فرمایا۔ 'کھلانا' ظاہر ہے کہ اپنے محدود مفہوم میں نہیں بلکہ وسیع معنی یعنی ماحتیاج پوری کرنے کے مفہوم میں ہے۔ اس کے ساتھ 'فِیْ یَوْمٍ

ذِیْ مَسْغَبَۃٍ' (بھوک اور قحط کے زمانے میں) کی قید اپیل کو مؤثر بنانے کے لیے ہے۔ یہ کام ہے تو ہمیشہ نیکی کا لیکن قحط کے زمانے میں اس کی قدر و قیمت بہت بڑھ جاتی ہے۔ 'یَتِیْمًا' کے ساتھ 'ذَا مَقْرَبَۃٍ' (قرابت مند) کی قید بھی دعوت کو مؤثر بنانے ہی کے لیے ہے۔ یوں حقدار تو ہر یتیم مدد کا ہے لیکن قرابت دار یتیم کا حق خاص طور پر دو چند ہو جاتا ہے۔ علیٰ ہذا القیاس 'مِسْکِیْنًا' کے ساتھ 'ذَا مَتْرَبَۃٍ' (خاک آلود) کی صفت بھی اس تلقین کو مؤثر بنانے ہی کے لیے ہے۔

ثُمَّ کَانَ مِنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَۃِ (۱۷)

یہ آگے کا قدم ہے جو ان لوگوں کو اٹھانا چاہیے۔

نیکی کرنے والے کو نیکی کا داعی بھی بننا چاہیے

جن کی آنکھوں میں عبرت نگاہی اور دلوں میں اثر پذیری ہوتی ہے ان سے اوپر بیان کی ہوئی نیکیوں کی بھی توقع کی جاتی ہے اور یہ توقع بھی ان سے کی جانی چاہیے کہ وہ ایمان لانے والوں اور صبر اور ہمدردئ خلق کی دعوت دینے والوں میں سے بنیں گے۔ اگر وہ نہ بنیں تو یہ دلیل ہے اس بات کی کہ ان کے روحانی و اخلاقی ارتقار کی راہ میں کوئی غیر فطری رکاوٹ ہے جس کو وہ عبور نہ کر سکے۔

نیکی کے کاموں کا خاص مزاج اور ان کے لیے صبر کی ضرورت

یہاں 'مَرْحَمَۃ' (ہمدردی) کے ساتھ 'صبر' کا ذکر اسی طرح آیا ہے جس طرح سورۂ عصر میں 'حق' اور 'صبر' کا ذکر ایک ساتھ آیا ہے۔ اس کی وجہ نیکی کے کاموں کا وہ مزاج ہے جس کی طرف ہم 'اقتحام عقبۃ' کی وضاحت کرتے ہوئے اشارہ کر چکے ہیں کہ نیکی کے کام بالعموم نفس کی خواہشوں کے خلاف ہیں اس وجہ سے ان کے انجام دینے کے لیے انسان کو نفس کی مزاحمت کرنی اور ایک چڑھائی سی چڑھنی پڑتی ہے۔ یہ چڑھائی وہی لوگ چڑھ سکتے ہیں جن کے اندر 'صبر' کی خصلت مستحکم ہو۔ 'صبر' کا اصل مفہوم عزیمت و استقامت ہے۔ جن کے اندر یہ وصف نہ ہو وہ کوئی کام بھی پامردی کے ساتھ نہیں کر سکتے اس وجہ سے ضروری ہوا کہ جن کو نیکی کا درس دیا جائے ان کو ساتھ ہی صبر و استقامت کی بھی تلقین کی جائے۔ یہاں اشارے پر قناعت کیجیے، سورۂ عصر کی تفسیر میں ان شاء اللہ اس کے تمام اطراف بحث میں آئیں گے۔

اُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ الْمَیْمَنَۃِ ۝ وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا بِاٰیٰتِنَا ھُمْ اَصْحٰبُ الْمَشْئَمَۃِ ۝ عَلَیْھِمْ نَارٌ مُّؤْصَدَۃٌ (۱۸-۲۰)

نیکوں اور بدوں کے انجام کا فرق

یہ آخر میں ان لوگوں کا انجام بیان فرمایا جو نیکی کے مذکورہ کاموں کا حوصلہ کریں گے اور جو ان سے محروم رہیں گے۔ فرمایا کہ جو لوگ یہ کام کریں گے تو وہ خوش بخت اور بامراد ہیں اور جو اللہ کی باتوں کی تکذیب ہی پر اڑے رہیں گے وہ بدبخت و نامراد ہیں، وہ آگ کے اندر بند کر دیے جائیں گے۔

یہاں تقابل کے اصول پر پہلے ٹکڑے میں اتنی بات محذوف ہے کہ 'اصحٰب المیمنۃ' جنت

کے بالا خانوں میں ہوں گے۔

لفظ 'مَیْمَنَۃ'، 'یمین' (دہنے) سے بھی ہو سکتا ہے اور 'یمن' (مبارکی اور خوش بختی) سے بھی لیکن یہاں یہ 'مَشْئَمَۃ' کے مقابل میں آیا ہے جو لاز ماً 'شوم' (نحوست اور بدبختی) سے ہے۔ اس وجہ سے اس کو بھی 'یمن' سے لینا پڑے گا۔ میں نے ترجمہ میں اسی پہلو کو اختیار کیا ہے۔ ویسے یہ فرق محض لفظی ہوگا۔ اصل مدعائے کلام کے اعتبار سے کوئی بڑا فرق نہیں ہوگا۔ قرآن میں ان دونوں گروہوں کو 'اَصْحَابُ الْیَمِیْن' اور 'اَصْحَابُ الشِّمَال' سے بھی تعبیر فرمایا گیا ہے۔ سورۂ 'حاقّۃ' میں اس تعبیر کی وجہ بھی بتا دی گئی ہے کہ نیکوں کو ان کے اعمال نامے ان کے دہنے ہاتھ میں پکڑائے جائیں گے اور بدوں کو ان کے بائیں ہاتھ میں، ان دونوں تعبیروں میں بس یہ فرق ہے کہ ایک میں ان کی ظاہری تقسیم کا اعتبار ہے، دوسری میں ان کی معنوی تقسیم کا۔ جن کو ان کے اعمال نامے ان کے داہنے ہاتھ میں پکڑائے جائیں گے ظاہر ہے کہ وہ خوش بخت ہوں گے اور جن کو ان کے اعمال نامے ان کے بائیں ہاتھ میں پکڑا دیے جائیں گے ان کی بدبختی اور محرومی بھی امر بدیہی ہے۔

'عَلَیْہِمْ نَارٌ مُّؤْصَدَۃٌ'۔ 'اوصد الباب' کے معنی ہیں 'دروازہ بند کر دیا'، مطلب یہ ہوا کہ ان کو آگ میں موند کر اوپر سے دروازے بند کر دیے جائیں گے۔ اعاذنا اللّٰہ من ذلک۔

اللّٰہ تعالیٰ کے فضل سے ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فللّٰہ الحمد۔

لاہور

۳۱۔ دسمبر ۱۹۷۹ء

۱۱۔ صفر ۱۴۰۰ھ